بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ۵

اشارات

پچھلی صحبت میں یہ بتایا جاچکا ہے کہ جماعت اسلامی جس دعوت پر قائم ہوئی ہے اس کا مقصد اول روز سے یہ تھا کہ دینِ حق کو اس کی اصلی اور مکمل صورت میں پورے نظام زندگی پر غالب کیا جائے۔ اس مقصد کے مختلف پہلوؤں سے مسلمانوں کے مختلف الخیال اشخاص اور گروہوں کو جس جس نوعیت کے اختلافات ہیں ان کی طرف بھی مختصر اشارات کئے جاچکے ہیں۔ اب ہم ذرا تفصیل کے ساتھ یہ بتانا چاہتے ہیں کہ پچھلے اٹھارہ سال میں یہ تحریک کن مراحل سے گزرتی ہوئی آرہی ہے۔ اس بیان سے مقصود محض تاریخ نگاری نہیں ہے۔ دراصل جو کچھ ہم چاہتے ہیں وہ یہ ہے کہ اپنے نصب العین کے لئے ہم نے اب تک جو کام جس طرح کیا ہے اسے لوگ اچھی طرح سمجھ لیں تاکہ آئندہ جو کچھ ہم کرنا چاہتے ہیں اس کا سمجھنا ان کے لئے آسان ہو۔

۱۳۵۲ھ (۱۹۳۳ء) میں جب اس تحریک کا آغاز ہوا اُس وقت ہمارے سامنے اولین کام یہ تھا کہ مسلمانوں کے صاحبِ فکر و فہم طبقے کو اسلام کا معتقد بنایا جائے۔

عام انسانوں کے بجائے خصوصیت کے ساتھ مسلمانوں کو ہم نے اس لئے خطاب کیا کہ دُنیا میں مسلمان اسلام کے جیتے جاگتے نمائندے ہیں، خواہ وہ اپنی اس حیثیت کا شعور رکھتے ہوں یا نہ رکھتے ہوں، بہرحال دُنیا ان کو نظرانداز کرکے خالص! د مجرد اسلام کو محض الفاظ کی مدد سے سمجھنے کے لئے تیار نہیں ہوسکتی۔ اس کو جب کبھی اسلام کی طرف دعوت دی جائے گی، اس کی نگاہ لامحالہ اُن لوگوں کی طرف اٹھے گی جو پہلے سے اس دین کے پیرو ہیں۔ اور اگر وہ اپنی زندگی میں انسانیت کا کوئی دلکش نمونہ پیش نہ کر رہے ہوں تو دُنیا سے یہ توقع کرنا بہت مشکل ہے کہ وہ اس دین کے اتباع سے اپنی فلاح و بہبود کی امیدیں وابستہ کرے گی۔ اس لئے دُنیا میں نظام حق برپا کرنے کے لئے یہ بالکل ناگزیر ہے کہ اگر سارے مسلمان نہیں تو کم ازکم اُن میں کوئی ایک گروہ ایسا ضرور موجود ہو جو اپنی انفرادی و اجتماعی زندگی میں اسلام کی صحیح نمائندگی کرتا ہو۔

مسلمانوں میں سے بھی عوام کو چھوڑ کر خاص طور پر ہم نے ان کے اہل دماغ طبقے کو خطاب کیا، کیونکہ ایک قوم کے اصل رہنما اس کے اہل دماغ لوگ ہی ہوتے ہیں۔ زندگی میں جو راستہ بھی وہ اختیار کرتے ہیں عوام ان کے پیچھے اس راستے پر ہو لیتے ہیں۔ اس لئے ہم نے عام مسلمانوں کی اعتقادی و عملی اصلاح سے پہلے ضروری سمجھا کہ اپنی کوششوں کو اُن خواص کی اصلاح پر مرکوز کر دیں جو اپنی علمی و ذہنی صلاحیتوں کی وجہ سے قوم کی رہنمائی کرتے ہیں۔ یہ تخصیص اس لئے بھی ضروری تھی کہ معاشرے کی عام اصلاح کے لئے جو کام ہم کرنا چاہتے تھے اس کے لئے کارکن ہم کو بہرحال اہل دماغ طبقے ہی سے مل سکتے تھے۔

پھر اصلاح کے معاملے میں بھی ہم نے اخلاقی و عملی اصلاح پر فکری و ذہنی اصلاح کو مقدم رکھا کیونکہ خیال ہی اخلاق و کردار کی جڑ ہے۔ کسی شخص یا گروہ کی زندگی میں کوئی عملی تغیر اس وقت تک نہیں ہو سکتا جب تک اس کے نظریات نہ بدلیں، اس کے سوچنے کا انداز نہ بدلے، اور اس کی اقدار نہ بدل جائیں۔

یہ تھا اس دعوت کی راہ میں ہمارا پہلا قدم۔ یہ خالص تنقید اور تبلیغ و تلقین کا مرحلہ تھا جو ۱۳۳۳ھ سے ۱۳۴۱ھ تک پورے ۹ سال رہا۔

اس میں ایک طرف جاہلیت کے ہر گوشے پر تنقید کی گئی۔ قدیم مشرکانہ اور راہبانہ جاہلیتوں پر بھی اور جدید مغربی جاہلیت پر بھی۔ جاہلیت کے اُن اثرات پر بھی جو اپنی پچھلی تاریخ کے دوران میں ہم قبول کرتے رہے ہیں، اور ان اثرات کو بھی جنھیں آج ہم اپنی زندگی میں لئے ہوئے ہیں۔ ان ساری جاہلیتوں پر تنقید کر کے ان کی عقلی کمزوریوں اور ان کے اخلاقی و تمدنی نقصانات کو واضح کیا گیا، اور پورا تجزیہ کر کے بتایا گیا کہ اسلام کا راستہ اپنی فکری بنیادوں اور اپنے عملی نتائج میں ان جاہلیتوں سے کس کس طرح ممیز ہے۔ اسی طرح مسلمانوں کے مختلف مدارس فکر پر بھی تنقید کی گئی۔ فقہی جمود کے حامیوں پر بھی اور اجتہادِ مطلق کے مدعیوں پر بھی۔ حدیث کا انکار کرنے والوں پر بھی اور حدیث کے بارے میں غلو کرنے والوں پر بھی۔ دین سے آزاد ہونے والوں پر بھی اور دین کو اپنی خواہشات کا پابند بنانے والوں پر بھی۔ اس پورے تنقیدی کام میں جو کچھ ہمارے پیش نظر تھا وہ صرف یہ تھا کہ مسلمانوں کے صاحب فکر لوگوں کی اُن ذہنی الجھنوں کو دور کیا جائے جن کی وجہ سے ان کے لئے اسلام کو سمجھنا اور خیالات کے جنگل میں اُس کی شاہراہ کو صاف صاف دیکھنا مشکل ہو رہا تھا۔ اسی لئے

جب کبھی ہماری تنقیدوں پر بگڑ کر کسی نے ہم کو بحث میں الجھانا چاہا ——— اور اس کی نوبت بارہا آئی ہے —— تو ہم نے اس کے ساتھ الجھنے سے انکار کر دیا، کیونکہ ہمارے لئے یہ بحثیں مقصود بالذات نہ تھیں بلکہ اپنے نصب العین کی راہ صاف کرنے کے لئے ہم نے ایک ناگزیر ضرورت کے طور پر انھیں اختیار کیا تھا اور ہم ان میں الجھ کر اپنی راہ کھوٹی کرنے کے لئے تیار نہ تھے۔

دوسری طرف اس مرحلے میں اسلام کے پورے نظام زندگی کو، جیسا کہ وہ خدا کی کتاب اور اس کے رسول کی سنت میں بیان ہوا ہے، معقول اور مدلل اور مفصل طریقے سے پیش کیا گیا۔ اس کے عقائد اور ایمانیات کیا ہیں۔ اس کا نظریۂ کائنات و انسان کیا ہے۔ اس کا فلسفۂ اخلاق کیا ہے۔ اس کی عبادات کس غرض کے لئے ہیں۔ وہ انسانی سیرت و کردار کو کس سانچے میں ڈھالنا چاہتا ہے۔ اس کی تہذیب کے بنیادی اصول کیا ہیں۔ وہ تمدن، معیشت، معاشرت اور سیاست کے لئے کیا قاعدے تجویز کرتا ہے۔ اس کے مزاج سے کس قسم کا نظام تعلیم مناسبت رکھتا ہے۔ وہ انسانی زندگی کے مسائل کو پہلے کس طرح حل کرتا رہا ہے اور آج کس طرح کر سکتا ہے۔ اس کے نظام زندگی کو برپا کرنے کے لئے پہلے کیا کچھ کیا گیا ہے اور آج کیا کیا جا سکتا ہے۔ ان تمام امور کو جہاں تک ہمارے بس میں تھا ہم نے ایسے طریقوں سے پیش کرنے کی کوشش کی جو موجودہ دور کے ایک تعلیم یافتہ آدمی کو مطمئن کر سکیں۔ مگر اس کام سے ہمارا مقصد محض ایک علمی خدمت انجام دینا نہ تھا بلکہ اول روز سے ہمارے پیش نظر یہ تھا کہ جو لوگ سوچ سمجھ کر اسلام کے معتقد ہیں وہ اس کو عملاً قائم کرنے کے لئے بھی تیار ہو جائیں۔ اسی لئے ہم ہر قدم پر دماغوں کو مطمئن کرنے کے ساتھ دلوں کو اکسانے کی بھی کوشش کرتے رہے، اور ایمان کی دعوت کے ساتھ یہ بات بھی ذہن نشین کرتے رہے کہ کوئی دین کسی دوسرے دین کی آغوش میں پرورش نہیں پا سکتا، لہٰذا جو لوگ بھی سچے دل سے اسلام کی پیروی کرنا چاہتے ہوں انھیں دنیا میں کفر کی امامت کے بجائے اسلام کی امامت قائم کرنے کے لئے سر دھڑ کی بازی لگانے پر تیار ہونا چاہئے۔

اس مرحلے کے کام کو جو لوگ اچھی طرح سمجھنا چاہیں وہ اگر ہماری مطبوعات کو ذیل کی تاریخی ترتیب کے ساتھ مطالعہ فرمائیں تو ان کے سامنے وہ پورا نقشہ واضح ہو سکتا ہے جس پر شروع سے ۱۹۴۱ء کے اختتام تک کام کیا گیا:

۳۳ء، اسلامی تہذیب اور اس کے اصول و مبادی[1]۔ مسئلہ جبر و قدر۔

۳۴ء۔۳۸ء، تنقیحات۔ تفہیمات حصہ اول و دوم۔

۳۵ء، حقوق الزوجین۔ اسلام اور ضبطِ ولادت۔

۳۶ء۔۳۷ء، رسالۂ دینیات۔ سود۔ پردہ۔

۳۸ء، خطبات۔

۳۹ء، اسلام کا نظریۂ سیاسی۔ اسلامی عبادات پر ایک تحقیقی نظر۔

۴۰ء، تجدید و احیاء دین۔ اسلامی حکومت کس طرح قائم ہوتی ہے۔ ایک اہم استفتاء۔

۴۱ء، قرآن کی چار بنیادی اصطلاحیں۔ اسلام اور جاہلیت۔ نیا نظامِ تعلیم۔ انسان کا معاشی مسئلہ اور اس کا اسلامی حل۔

شاید یہ مرحلہ ابھی کچھ اور دراز ہوتا، لیکن اس دوران میں ملک کے سیاسی حالات جو پلٹا کھا رہے تھے اس کو دیکھتے ہوئے ہمارے لئے یہ ضروری ہوگیا کہ بغیر کسی مزید تاخیر کے دوسرے مرحلے کی طرف قدم اٹھائیں۔

انگریزی حکومت نے انیسویں صدی کے دورِ آخر سے ہندوستان میں جمہوری ادارات قائم کرنے اور باشندگانِ ملک کو حکومت کے اختیارات میں حصہ دار بنانے کا جو سلسلہ شروع کر رکھا تھا اس کی پوری بنیاد جمہوریت کے اُن قاعدوں پر مبنی تھی جو خود انگریزوں کے اپنے گھر میں رائج تھے۔ انھوں نے یہ سمجھا تھا کہ انگلستان کی طرح ہندوستان کے باشندے بھی بلا لحاظِ مذہب و ملت ایک قوم ہیں اس لئے یہاں بھی انگلستان کے نمونے پر ایک ایسی جمہوری حکومت بن سکتی ہے جس میں اکثریت کے نمائندے ملک کا انتظام اپنی صواب دید کے مطابق چلائیں اور اقلیت کے نمائندے حزبِ اختلاف میں رہتے ہوئے اکثریت حاصل کرنے کی کوشش کرتے رہیں۔ اس کے ساتھ وہ اپنا مخصوص تمدنی و سیاسی فلسفہ بھی رکھتے تھے جسے انھوں نے اور ان کے شاگردوں نے ایک اٹل حیثیت دے رکھی تھی، اور وہ یہ تھا کہ مذہب کا تعلق صرف انفرادی عقیدہ و عمل سے ہے، ریاست کو لازماً غیر مذہبی (سیکولر) ہونا چاہیے۔ یہ نظریات، جن پر ملک کا نظام ڈھالا جا رہا تھا اور جن کے مطابق ہر آئینی ترقی کے ساتھ زیادہ اختیارات اکثریت کی طرف منتقل ہوتے چلے جا رہے تھے، اس قوم کے مفاد کے عین مطابق تھے جو ہندوستان

[1] افسوس ہے کہ یہ سلسلۂ مضامین ابھی تک ترجمان القرآن کے پرانے فائلوں میں دفن پڑا ہے۔ اسے کتابی صورت میں شائع کرنے کی نوبت نہیں آسکی ہے۔

کی آبادی میں اکثریت رکھتی تھی، اس لئے اس نے نہ صرف انھیں قبول کیا بلکہ وہ ان کی زبردست حامی اور وکیل بن گئی چنانچہ انڈین نیشنل کانگریس کی پوری تحریک اول روز سے قائم ہی اس بنیاد پر ہوئی تھی کہ انھی نظریات کے مطابق ملک میں ذمہ دارانہ حکومت کے قیام کی جدوجہد کرے لیکن مسلمان، جن کے لئے اس "قومی، جمہوری، لادینی ریاست" کے نظریہ کا ہر جزء زہر قاتل کا حکم رکھتا تھا، مسلسل تذبذب میں مبتلا رہے اور اپنے لئے کوئی صحیح راستہ تجویز نہ کرسکے۔ اول اول انھوں نے کوشش کی کہ سرے سے حکومت کے اختیارات باشندوں کی طرف منتقل ہی نہ ہوں بلکہ تمام اختیارات انگریز حکمراں اپنے ہاتھ میں رکھیں۔ پھر جب یہ پالیسی چلتی نظر نہ آئی تو انھوں نے واحد قومیت کی بنیاد پر جمہوری حکومت کے اصول کو تسلیم کرلیا اور صرف اس امر کی کوشش شروع کردی کہ کسی طرح اس نظام میں ان کے لئے ایسے آئینی تحفظات رکھ دئیے جائیں جن کی پناہ میں وہ اپنی انفرادیت برقرار رکھ سکیں۔ پھر وہ یکایک خلافت کے زمانے میں ہندو مسلم اتحاد کا نعرہ لگانے لگے اور اکثریت کے اعتماد پر بالکل اپنے آپ کو اس کے حوالے کرنے پر آمادہ ہوگئے۔ اس کے بعد انھوں نے پھر "آئینی تحفظات" کے مطالبے کی طرف رجوع کیا اور اس سوال پر رفتہ رفتہ ان کے اندر پھوٹ پڑنی شروع ہوئی۔ ایک گروہ اس بات کا قائل ہوگیا کہ پہلے اکثریت کے ساتھ مل کر آزادی حاصل کرلی جائے، پھر "تحفظات" کا سوال چھیڑا جاسکتا ہے، اور دوسرا گروہ اس اصرار پر قائم رہا کہ پہلے "تحفظات" کا معاملہ طے کرلیا جائے پھر حصولِ آزادی کے لئے اکثریت کے ساتھ تعاون کیا جاسکتا ہے۔ مگر یہ بات دونوں گروہوں میں بہرحال متفق علیہ رہی کہ انھیں درکار صرف ایسے آئینی تحفظات ہیں جو ایک "قومی جمہوری لادینی ریاست" میں ان کے مستقل قومی وجود اور ان کی جداگانہ دینی تہذیب کو زندہ رکھ سکیں۔ یہ بات ان دونوں گروہوں میں سے کسی کو بھی نہ سوجھی کہ واحد قومیت کے اصول پر جو جمہوری نظام بنے اس کے اندر کسی گروہ کی جداگانہ قومیت باقی نہیں رہ سکتی، اور ایک لادینی ریاست میں کسی دینی تہذیب کا نشوونما پانا ممکن نہیں ہے۔

یہ حالات تھے جب ۱۹۳۵ء کا ایکٹ بنا اور ۱۹۳۷ء میں اس کا وہ حصہ ملک میں نافذ ہوا جس کی رو سے صوبوں کو ذمہ دارانہ حکومت کے وسیع اختیارات دئیے گئے تھے۔ اب یہ صاف نظر آرہا تھا کہ ہندوستان کی تاریخ کا وہ عارضی دور عنقریب ختم ہونیوالا ہے جس میں ایک بیرونی قوم کے مٹھی بھر افراد یہاں حکومت کررہے تھے اور وہ مستقل دور شروع ہونیوالا ہے جس میں واحد قومیت، جمہوریت اور لادینی کے اصولوں پر اسی ملک کی اکثریت یہاں حکومت کرے گی۔ اس موقع پر ہمارے لئے یہ ضروری ہوگیا کہ اس آنے والے دور کے خطرات مسلمانوں کے سامنے صاف صاف کھول کر پیش کردیں، کیونکہ ہمارے سامنے یہ

بات بالکل واضح تھی کہ اس نظام میں کوئی آئینی تحفظ مسلمانوں کو اور ان کی تہذیب کو اکثریت اور اس کی تہذیب میں گم ہونے سے نہ بچا سکے گا اور اس صورت میں ہمارے لئے اپنے نصب العین کا حصول اگر ناممکن نہیں تو نہایت دشوار ضرور ہو جائیگا چنانچہ اسی خطرے کو محسوس کر کے ۳۷ء سے ۳۹ء تک مسلسل تین سال ان صفحات میں وہ مضامین لکھے جاتے رہے جو "مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش" حصہ اول و حصہ دوم اور "مسئلہ قومیت" کے نام سے کتابی صورت میں شائع ہو چکے ہیں۔ ان مضامین میں ہم نے مسلمانوں کو یہ احساس دلایا کہ اگر انھوں نے واحد قومیت کا اصول تسلیم کر کے ایک جمہوری لا دینی نظام کے قیام کو قبول کر لیا تو یہ ان کے لئے خودکشی کا ہم معنیٰ ہوگا۔

ہمیں یہ دعویٰ نہیں ہے کہ ان تین سالوں کے دوران میں مسلمانوں کے اندر کانگریسی نظریہ کا زوال اور اپنی جداگانہ قومیت کے احساس کا نشوونما جو کچھ بھی ہوا وہ ہماری ان کوششوں کا نتیجہ تھا، مگر اس بات سے شاید ہمارا کوئی مخالف بھی سچائی کے ساتھ انکار نہیں کر سکتا کہ نتیجہ کے ظہور میں کچھ ہماری کوششوں کا دخل بھی تھا۔

اس کے بعد مسلمانوں کے لئے یہ نازک سوال حل طلب تھا کہ وہ اس پیچیدگی سے کس طرح نکلیں جس میں ملک کے سیاسی ارتقاء نے ان کو مبتلا کر دیا ہے۔ کانگریسی مسلمانوں کا نظریہ اب ان کے لئے قابلِ قبول نہ رہا تھا۔ یہ بات بھی اب وہ سمجھ چکے تھے کہ واحد قومیت کے اصول پر جو جمہوری نظام بنے گا اس میں کوئی آئینی تحفظ ان کے کام نہیں آسکتا۔ مگر اب اس پیچیدگی کا حل کیا ہے؟ یہ سوال سخت پریشان کن تھا! ایک گروہ نے یہ خیال پیش کیا کہ تقسیم ملک کا مطالبہ کیا جائے اور ان علاقوں کو ہندوستان سے الگ کرا لیا جائے جن میں مسلمانوں کی اکثریت ہے لیکن بہت سے لوگوں کو، جن میں ابتداءً خود مسٹر جناح مرحوم بھی شامل تھے، اس حل کو قبول کرنے میں اس بنا پر تامل تھا کہ یہ صرف آدھی قوم کے مسئلے کو حل کرتا ہے، بقیہ آدھی قوم، جو ہندوستان کے بڑے حصے میں کمزور اقلیت کی حیثیت سے منتشر ہے بالکل اکثریت کے رحم پر چھوٹ جاتی ہے۔

اس موقع پر ہم نے ۳۹ء میں ایک دوسرا سلسلۂ مضامین شروع کیا جو ۴۰ء میں "مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش" حصہ سوم کے نام سے شائع ہوا۔ اس میں ہم نے مسلمانوں کے سامنے یہ خیال پیش کیا کہ آپ جس پیچیدگی میں اپنے آپ کو اس وقت مبتلا پا رہے ہیں اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ آپ نے مسلمان کو محض ایک قوم سمجھ لیا ہے، اور قوم ہونے کی حیثیت سے آپ سمجھتے ہیں کہ جمہوریت میں آپ کی طاقت کا مدار صرف تعداد پر ہے۔ اسی لئے آپ اس دوگونہ مشکل میں پھنس گئے ہیں کہ اگر ہندوستان ایک رہتا تو آپ کی پوری قوم

فنا ہوتی ہے اور اگر تقسیم ہوتا ہے تو آدھی قوم کو قیمت میں دینا پڑتا ہے لیکن درحقیقت آپ محض ایک قوم نہیں ہیں بلکہ ایک اصول اور ایک نظریہ کی حامی جماعت ہیں۔ آپ کی حیثیت جرمن، فرنچ اور انگریز کی طرح ایک نسلی قوم کی سی نہیں ہے، بلکہ سوشلسٹ اور کمیونسٹ کی طرح ایک اصولی پارٹی کی سی ہے پچھلی صدیوں میں آپ اپنے اصولوں کی طاقت سے ملک کے ملک جیت چکے ہیں خود ہندوستان میں بھی جو کروڑوں مسلمان نظر آتے ہیں وہ انہی اصولوں سے مسخر ہوئے تھے۔ لہٰذا اگر آپ قومی حقوق اور قومی مفاد کے بجائے اپنے اصول اور اپنے نظریۂ حیات کے لئے جدوجہد شروع کر دیں تو صرف یہی نہیں کہ ہندوستان میں آپ مٹائے نہ جاسکیں گے، بلکہ اس امر کا بھی نہایت قوی امکان ہے کہ چند سال کے اندر پورا ہندوستان دارالاسلام بن جائے۔ کیونکہ ہندوستان کی کسی دوسری قوم یا پارٹی کے پاس اتنے جاندار اصول موجود نہیں ہیں جیسے اسلام نے آپ کو دئے ہیں۔

ہم نے اس خیال کو اپنی پوری طاقت کے ساتھ پیش کیا اور کوشش کی کہ مسلمان اسے اپنالیں لیکن قوم کی عظیم اکثریت کو اس نے اپیل نہ کیا۔ ۱۹۴۰ء میں مسلم لیگ نے اپنا وہ مشہور ریزولیوشن پاس کر دیا جس میں پاکستان کو مسلمانوں کا قومی نصب العین قرار دیا گیا تھا اور ۱۹۴۱ء تک پہنچتے پہنچتے یہ بات بالکل واضح ہو گئی کہ مسلمان بحیثیت ایک قوم کے اس کو اپنا مطمح نظر بنا چکے ہیں۔

اب ہمارے سامنے دو نہایت اہم اور نازک سوال غور طلب تھے! ایک یہ کہ اگر ملک تقسیم ہو تو ہندوستان کے بڑے حصے میں جو کروڑوں مسلمان رہ جائیں گے ان کے اندر اسلام کی شمع روشن رکھنے اور اس کے نور کو پھیلانے کی کیا صورت ہو گی؟ دوسرے یہ کہ اگر پاکستان انہی لیڈروں کی رہنمائی میں قائم ہو جو اس وقت اس تحریک میں پیش پیش ہیں تو اس کو ٹرکی کی طرح ایک لادینی ریاست بننے سے بچانے اور ایک حقیقی اسلامی ریاست بنانے کے لئے کیا تدبیر کی جا سکتی ہے؟ ہمارے نزدیک یہ دو سوالات اس قدر اہم تھے کہ اس برعظیم میں اسلام کے مستقبل کا انحصار انہی کے صحیح حل پر موقوف تھا۔ ہم نے ان پر مہینوں غور و فکر کیا اور آخر کار اس نتیجہ پر پہنچے کہ اب ان تمام لوگوں کو منظم کرنے کا وقت آگیا ہے جو پچھلے ۹ سال میں ہماری دعوت سے متأثر ہو چکے ہیں۔ چنانچہ اگست ۱۹۴۱ء میں ان کو جمع کیا گیا اور "جماعت اسلامی" کی بنا ڈالی گئی! اس تنظیم سے ہمارا مقصد یہ تھا کہ اسی وقت سے ایک ایسے منظم اور تربیت یافتہ گروہ کو تیار کرنا شروع کر دیا جائے جو اس برعظیم میں اسلام کے غلبے کے لئے کام کرنے کے قابل ہو۔ اگر خدانخواستہ مسلمان تقسیم ملک کی جدوجہد میں ناکام ہو جائیں تو یہ گروہ اس ناکامی کے خوفناک نتائج کا مقابلہ کرنے کے لئے موجود رہے، اور اگر ملک تقسیم ہو جائے تو ہندوستان اور پاکستان دونوں میں یہ گروہ اسلام کا علم بلند کرنے کے لئے تیار رہے۔

اسی طرح ہماری یہ دعوت دوسرے مرحلے میں داخل ہوئی۔